ریسرچ جرنل تحقید

جلد 04، شمارہ 02، دسمبر 2023

شاہد رضوان کا ناول "چاند پور" میں موضوعاتی تنوع

Thematic diversity in Shahid Rizwan's novel "Chand Pur"

ڈاکٹر محمد کامران شہزاد

وزٹنگ لیکچرار شعبۂ اُردو، یونیورسٹی آف سرگودھا،

ڈاکٹر فرزانہ ریاض

اسسٹنٹ پروفیسر، جی سی یونیورسٹی لاہور۔

Dr. Muhammad Kamran Shahzad
Visiting Lecturer Department of Urdu University of Sargodha
Dr. Farzana Riaz
GC University Lahore

eISSN: 2789-6331
pISSN: 2789-4169

Copyright: © 2023 by the authors. open-This is an article access distributed under the terms and conditions of the Creative Common Attribution (CC BY) license

ABSTRACT:

In the 21st century, the superpowers of the world celebrated their iron in the world due to modern scientific development and modern defense inventions. At the same time, where they were facing many challenges, these global powers were helpless in front of the Corona virus and soon the Corona virus had spread its claws all over the world. Like other countries, the corona virus not only affected every sphere of life in Pakistan, but also left its effects for a long time. The theme of Corona was dominant in the works of Pakistani writers. In this regard, Shahid Rizwan's novel "Chand pur" has a stable identity. In this paper, in "Chand pur" two years of Corona, the problems of public life, the reflection of government policies and the depiction of life after the epidemic, civilization and history and the eternal story of love have been critically evaluated.

Keys Words: Shahid Rizwan, Novel, Chand Pur, Thematic Diversity

ہر عہد میں انسانی زندگی مختلف مسائل اور اتھل پتھل کا شکار رہتی ہے۔ان سیاسی، سماجی، معاشرتی، ثقافتی، معاشی مسائل اور انسان کی داخلی خارجی کیفیات کی ترجمانی کا بہترین وسیلہ اگر ادب کی کسی صنف میں ہے تو وہ ناول ہے کیونکہ ناول کا کینوس وسیع ہوتا ہے اور وہ کئی دہائیوں کے حالات کو اپنے بیانیہ کے ذریعے قاری تک پہنچا سکتا ہے۔ بیسویں صدی کے اُردو ناول میں ترقی پسندی، رومانیت، جدیدیت، مابعد

جدیدیت اور سیاسی و سماجی موضوعات غالب نظر آتے ہیں،جب کہ اکیسویں صدی کا ناول فکری و فنی اعتبار سے مختلف نظر آتا ہے کیونکہ جدید سائنسی ترقی ،گلوبل ولیج اور عالمی طاقتوں کی اجارہ داری کے سبب معاشرے کے ہر فرد کا نہ صرف سوچنے کا انداز مختلف ہو گیا بلکہ ان کی ترجیحات میں مادیت پرستی نے گھر کر لیا، جس کے باعث اکیسویں صدی میں ہر طبقے کا فرد نفسیاتی کش مکش کا شکار نظر آتا ہے۔ سماج کے ان بدلتے رویوں کو دیکھتے ہوئے کئی ناول نگاروں نے ناقدین کے متعین کیے ہوئے اصول وضوابط کی پابندی کو توڑتے ہوئے علامتی و استعاراتی اسلوب میں اظہار کیا۔ اس ضمن میں مرزا اطہر بیگ کے ناول "غلام باغ، حسن کی صورتِ حال خالی۔۔۔۔ جگہیں۔۔۔۔ پر۔۔۔۔ کرو، خفیف مخفی کی خواب بیتی (بھیانک ماورائے عمومی واقعات پر مبنی یادداشتیں) ،ڈاکٹر شاہدہ دلاور کا ناول "زندگی ایک ناراض متن" ، محمد الیاس کے ناول "کہر، برف، حبس، اختر رضا سلیمی کا ناول "جاگے ہیں خواب میں" اور لواخ شامل کیے جاسکتے ہیں. جنھوں نے پلاٹ سے لے کر کردار نگاری کے اصولوں کو ضم کر کے اپنے اصولوں کے مطابق کہانی تشکیل دی. جس کا ادبی حلقوں میں ایک منفی تاثر یہ بن گیا کہ ایسے ناولوں کا ڈسکورس عام قاری کی فہم سے بالاتر ہے لیکن حقیقت میں یہ تمام ناول اپنے فکر و فن کے اعتبار سے اس صدی کے سب سے بہترین ناول ہیں۔

عمومی طور پر کہا جاتا ہے کہ ہر عہد کا تخلیق کار دوسرے تخلیق کار کے اندازِ تحریر سے متاثر ہو کر لکھتا ہے لیکن شاہد رضوان کے ناول "چاند پور" کے مطالعے سے بالکل ایسا نہیں لگتا کہ انھوں نے کسی بڑے ادیب سے متاثر ہو کر ناول کا بیانیہ تشکیل دیا ہے کیونکہ ان کے عہد میں ہر بڑا ادیب علامتی پیرائے میں فکشن لکھ رہا تھا۔ "چاند پور" مصنف کا دوسرا ناول ہے ،جو کہ دانیال پبلشرز لاہور نے 2023ء میں شایع کیا ۔اس سے قبل مصنف کے چار افسانوی مجموعے بعنوان "پتھر کی عورت ،پہلا آدمی، آوازیں، ادھوری کہانی "اور ناول "گنجی بار" کی اشاعت سے ادبی حلقوں میں بطور فکشن نگار اپنی مستحکم شناخت رکھتے ہیں کیونکہ ان کے اولین ناول کا موضوع تاریخ اور جدوجہد آزادی ہے۔ "گنجی بار" میں مصنف نے عصرِ حاضر کے قاری کو آخری مغل بادشاہ بہادر شاہ ظفر کے زمانے کی دیہاتی زندگی کی رنگینی اور مسائل سے روشناس کروایا ہے علاوہ ازیں "احمد خان کھرل "نامی کردار کے ذریعے جذبہ آزادی کی لگن کو اجاگر کیا ہے۔

مصنف نے ناول کا عنوان ضلع سائیوال کی تحصیل چیچہ وطنی کے قصبہ "چاند پور" کے نام سے رکھا ہے۔ناول کے بیانیے میں "چاند پور" کی منظر کشی پر چند صفحات ہی پڑھنے کو ملیں گے لیکن وہاں رونما ہونے والے واقعات میں تجسس کی فضا ایسے قائم کی ہے کہ اسی تجسس میں قاری ناول کے اختتام تک پڑھتا پہنچ جاتا ہے۔ مصنف نے ناول کا آغاز بڑے منفرد انداز میں "کہانی" کی ابتدا اور محرکات پر بحث کرتے ہوئے کیا ہے، جس سے اندازہ ہوتا ہے کہ مصنف کہانی میں غیر مرئی کردار اور مافوق الفطرت عناصر کا قائل نہیں ہے بلکہ حقیقت پر مبنی اور جیتے جاگتے کردار، جن کی خوشبو گرد و نواح میں آتی ہے، کو کہانی کا محرک سمجھتا ہے اور اس نتیجے پر پہنچتا ہے کہ سماج میں بے بس طبقہ ہی کسی کہانی میں تحرک پیدا کرنے کا سبب بنتا ہے کبھی بھی اشرفیہ یا مسند پر بیٹھے کی کہانی سے قاری کو سروکار نہیں ہوتا ہے کیونکہ قاری کو معاشرے کے پسے ہوئے اور مفلوج طبقے میں آپنا آپ عیاں ہوتا ہے۔ اقتباس ملاحظہ کیجیے:

> "کہانی تو ادھورے آدمی کی لکھی جاتی ہے۔ لولے، لنگڑے، آپاہج، بھک منگے اور پاگل انسان اپنے اندر کہانی کار کے لیے ایک خاص کشش رکھتے ہیں۔ جسے بقا کی مسند سے اترنا پسند نہ ہو اس کی کہانی کیسے لکھی جاسکتی ہے؟ ویسے بھی جسے اپنی کہانی لکھنے ہی سے فرصت نہ ملے وہ کسی دوسرے کی کہانی کیا لکھ سکتا ہے"(1)

"چاند پور" میں مصنف بطور کردار خود بھی شامل ہے، جس کے مشاہدہ سے یوں لگتا ہے کہ پاکستانی سماج کے ہر رخ کے مثبت اور منفی پہلو کو کیمرے کی آنکھ سے خود دیکھ رہا ہے اور اس پر اپنی رائے بھی بیانیے کا حصہ بناتا ہے، جس کے ذریعے پاکستانی سماج کے ہر طبقے کی قدامت پسندی، تنگ نظری بھی عیاں ہوتی نظر آتی ہے۔ ناول کا لوکیل چیچہ وطنی کے مختلف قصبے دس چک اوڈاں، کسووال اور چاند پور ہے۔ ناول کی کہانی در کہانی ایسے آگے بڑھتی ہے کہ یہ ایک طرف تو پاکستانی سماج کا نوحہ لگتی ہے تو دوسری طرف ہیر رانجھا کی داستان کی طرح محبت کی لازاوال کہانی بن جاتی ہے۔ شاہد رضوان نے آپ بیتی کی تکنیک کے ذریعے پاکستانی سماج کا عکس دکھایا ہے۔ اس لحاظ سے یہ ناول اہمیت کا حامل ہے کہ اس میں مصنف نے انسانی زندگی کے تمام سیاسی، سماجی، معاشی اور معاشرتی مسائل کو بطور موضوع رقم کیا ہے۔ پروین سجل ناول کے موضوع کے متعلق رقم طراز ہیں:

> "چاند پور" اصل میں پاکستان کے حقائق پر مبنی وہ کہانی ہے اور اس کی ایسی تصویر کشی کی ہے کہ جو مایوسی کا ایک ایسا گرد و غبار ہے، جس میں سانس لینا دشوار ہوتا جا رہا ہے"(2)

مصنف نے ناول کا آغاز کرونا وائرس کے دنوں سے کیا ہے۔ اس سے قبل پنجاب میں ڈینگی بخار اور اس کے نتیجے میں قیمتی انسانی جانوں کے ضیاع پر نہ صرف خامہ فرسائی کی بلکہ ڈینگی پر قابو پانے کے لیے حکومتی پالیسوں اور مختلف اداروں کی طرف سے منعقد کیے جانے والے سیمینار زپر برملا طنزیہ انداز امیں لکھا۔ علاوہ ازیں مصنف نے ڈینگی وائرس پر تحقیق کر کے دنیا میں پہلے مریض میں ڈینگی کی تشخیص اور پاکستان میں پہلے مریض کے متعلق معلومات سے بھی آگاہ کیا ہے۔ یہاں ہمیں مصنف ناول نگار سے زیادہ بطور محقق نظر آتا ہے۔

اکیسویں صدی کی دوسری دہائی کے آخری برسوں میں پوری دنیا "کرونا وائرس" کی لپیٹ میں آگئی، جس کا آغاز چین کے صوبے ووہان سے ہوا، اور دیکھتے ہی دیکھتے پورے مغرب میں پھیل گیا۔ ہر ملک نے اپنی عوام کے بچاؤ کے لیے حفاظتی تدبیریں اختیار کیں اور عوام کو آپس میں ملنے سے ممانعت کی گئی۔ پاکستان میں جب اس وبا کے پانچ کیس سامنے آئے تو حکومتِ وقت نے بھی حفاظتی تدابیر اختیار کرتے ہوئے تعلیمی ادارے اور بازار بند کروادیے اور دفتری کاموں کے لیے نصف ملازمین بلانے کی اجازت دی گئی۔ چونکہ ناول کی کہانی کرونا کے تین برسوں پر محیط ہے اس لیے مصنف نے آغاز میں جہاں وائرس کے متعلق حکومتی اقدامات کے متعلق منظر کشی ہے وہیں اس دوران اپنی خانگی زندگی کی پیچیدگیاں بھی مفصل سے بیان کی ہیں۔ اس کے علاوہ کرونا کے نزول کے بعد متعدد عوامی موشگافیاں بھی سننے اور دیکھنے کو ملی ہیں۔ مثلاً دنیا کی آبادی زائد ہو گئی ہے اس لیے آبادی کم کرنے کے لیے چین کے سائنس دانوں نے یہ وائرس تخلیق کیا ہے۔ کچھ نے کہا کہ امریکہ نے چین کو معاشی میدان میں زیر کرنے کے لیے وائرس بنوایا، اور ہمارے ہاں اسلام کے ٹھیکیداروں کے بقول یہ سب یہودیوں کی سازش ہے، وہ اسلام کو مٹانا چاہتے ہیں اسی لیے خانہ کعبہ کو حج کے لیے بھی بند کروادیا ہے اور مسلمانوں کی نسل کشی کرنا چاہتے ہیں یہودیوں کی بنائی ہوئی ویکسین لگوانا بھی حرام قرار دیا۔ یہاں مصنف ہمیں عوامی موشگافیوں کو رد کرتا ہوا نظر آتا ہے کیونکہ مصنف کے خیال میں ہمارا المیہ ہے کہ ہمیں جو چیز بھی مفت میں مل جاتی ہے ہم اس کی قدر نہیں کرتے ہیں۔ اقتباس ملاحظہ کیجیے:

> "صاحب جی فیاض کہتا ہے، جو ویکسین تو نے لگوائی ہے وہ کسی کام کی نہیں میرے ساتھ چلنا میں اصلی ویکسین لگوا کر دوں گا۔ کیا وہ سچ کہتا ہے؟ مجھے سمجھ نہ آئے کہ میں کیا کہوں۔ اس وقت مجھے راشد کی نظم اندھا کباڑی بہت یاد آئی۔ ہمیں مفت میں سونا بھی ملے تو ہم اسے کھوٹ سمجھ کر ٹھکرا دیتے ہیں اور بیش قیمت پر ملنے والی راکھ کو سونے پر ترجیح دیتے ہیں"(3)

ناول میں مرکزی کردار کا ہمجان کہانی کے ساتھ ساتھ سفر کرتا نظر آتا ہے، جس کو واحد متکلم "میرے ساتھ والا" بول کر قاری کو اس طرف متوجہ کرتا ہے۔ یہ بنیادی طور پر مرکزی کردار کے باطن میں حساس انسان ہے، جو معاشرے میں پھیلی بد عنوانی، ناانصافی، ظلم و جبر ہوتے دیکھ کر واحد متکلم کو جھنجھوڑتا ہے۔ جیسا کہ ناول میں ایک جگہ "ساتھ والا" اس قوم کے حال پر آنسو بہتا نظر آتا ہے کہ ہم اتنے گئے گزرے ہیں کہ ہر چیز میں مغربی سازش نظر آتی ہے۔ ایک طرف ہم وبا کے پھیلنے کا سبب مغرب کو سمجھتے ہیں تو دوسری طرف بائیس کی بائیس کروڑ عوام مغربی ممالک کے ویزے کے انتظار میں ہے۔ اسی طرح مرکزی کردار ویکسین کے متعلق مختلف افواہیں سنتا ہے تو "ساتھ والا" چڑ کر اس سے گویا ہوتا ہے کہ ہم جیسی بد دیانت، بد کردار قوم کو مٹا کر یہودیوں کو کیا ملے گا۔ کیونکہ بد قسمتی سے ہم اپنی بد اعمالیوں کے سبب قعر گمنامی میں کھو گئے ہیں :

> "ہمارے پلے آخر ایسی کون سی چیز ہے، جس سے خوفزدہ ہو کر یہودی ہمیں مٹانے پر تلے ہوئے ہیں
> ۔بد دیانت، بد خلاق اور بد کردار قوم کو مٹا کر انھیں کیا حاصل ہو گا، کوئی احمق سپاہی مرے ہوئے
> دشمن پر گولی ضائع کر سکتا ہے، یہودی سب کچھ ہو سکتے ہیں مگر احمق نہیں"(4)

کسی بھی ملک کے ریاستی ادارے اس ملک کی بقا اور سلامتی کی ضامن ہوتے ہیں اور اس کو مضبوط بنانے کے لیے عوامی حمایت بھی ضروری ہوتی ہے ۔ اسی طرح پاکستانی ادارے بھی ملک کی بقا کے لیے دن رات سر گرداں ہیں لیکن ان اداروں میں مسند پر بیٹھے افراد کی مادیت پرستی اور پالیسوں کے سبب عوامی مقبولیت کم ہوتی جا رہی ہے، جس کے باعث عوامی رویہ نوجوانوں کو تذلیل کرنے والا ہو گیا ہے۔ مصنف اس طرح کے عوامی رویے سے اختلاف کرتے نظر آتے ہیں۔ کہانی میں جب ایک نوجوان اپنے سابقہ ادارے کے متعلق مرکزی کردار کو کہتا ہے کہ "آپ جس طرف اشارہ کر رہے ہیں۔ ہم سپاہیوں تک تو اس کی خوشبو نہیں آتی ہم تو پیدا ہی حفاظت اور خدمت کے لیے ہوئے ہیں وہاں ضرورت نہ رہی تو اب آپ کی خدمت میں جت گئے دن کو ٹیکسی چلاتے ہیں اور رات کے وقت ایک کوٹھی پر چوکیداری کرتے ہیں"(5) یہاں مصنف قاری کو بتانا چاہتا ہے کہ کوئی بھی ادارہ فرد واحد یا چند مخصوص افراد پر مشتمل نہیں ہوتا ہے بلکہ وہ ٹیم ورک سے کام کرتا ہے لیکن اس ادارے میں چند افراد کی مادیت پرستی کے باعث پورے ادارے کو ہم گنہگار نہیں سمجھ سکتے ہیں۔

مادیت پرستی اس خطے کی عوام اور حاکمِ وقت کی سرشت میں شامل ہے، جو عہد مغلیہ سے چلی آ رہی ہے، جس کے باعث یہاں یا تو اشرافیہ طبقے کا مستقبل محفوظ ہے یا اداروں میں بیٹھے سربراہان کا اور یا پھر جاگیر دار طبقے کا، جس کے گھر میں قحط کے دنوں میں مال و اسباب وافر مقدار میں موجود ہوتا ہے۔ ناول نگار نے ایک طرف پاکستان میں طبقاتی تقسیم پر کڑی تنقید کی ہے تو دوسری طرف عام افراد کی منافقت اور مادیت پرستی پر طنز کیا ہے اس حوالے سے ظہیر الدین بابر کے دور کی مثال دی ہے کہ جب وہ ہندوستان فتح کرنے آیا تو راستے میں کسان اپنے کھیتوں میں کام کر رہا تھا، جب بابر نے اسے بتایا کہ میں ہندوستان فتح کرنے آیا ہوں تو وہ التجا کرنے لگا کہ میرے کھیت مجھے بخش دیں۔ اگر اس واقعہ کو موجودہ پاکستانی سماج کے تناظر میں دیکھا جائے تو سوائے افسوس کے کچھ نہیں بچتا ہے کیونکہ اکیسویں صدی میں تعلیم یافتہ اور دولت کی فراوانی کے باوجود ہم اجتماعی سوچ کے بجائے انفرادی سوچ رکھتے ہیں۔ ہر فرد یہی چاہتا کہ جائز یا ناجائز طریقے سے میرا کام ہو جائے اس کے لیے معاشرے یا ملک کو کتنی ہی بڑی قیمت ادا کرنی پڑے۔ اس سے اسے کوئی سروکار نہیں ہوتا ہے۔

ہمیں انگریزوں سے آزاد ہوئے پچھتر برس ہو چکے ہیں لیکن معاشی حوالے سے ہم آج بھی وہیں کھڑے ہیں، جہاں آزادی کے وقت تھے، جب کہ ہمارا ہمسایہ ملک بھارت ہمارے ساتھ آزاد ہوا تھا لیکن آج وہ دنیا کی پانچویں بڑی معیشت بن گیا ہے، جس رفتار سے وہ ترقی کر

رہا ہے، ایسا لگتا ہے مستقبل قریب میں وہ معاشی اعتبار سے سپر پاور امریکہ کا ہمنوا ہو گا۔ ناول نگار نے کہانی میں ان وجوہات پر بھی طنز کیا ہے، جس کے سبب ہماری ہر حکومت عالمی مالیاتی ادارے سے سخت کڑی شرائط پر قرض لیتی، جس کا خمیازہ غریب عوام پر کبھی تو پٹرول بم گرا کر، کبھی بجلی کے نرخوں میں اضافے کی صورت میں اور کبھی مہنگائی کی صورت میں بھگتنا پڑتا ہے۔ مصنف نے ان مسائل کی بڑی وجہ جاگیر داری نظام کو قرار دیا ہے، جس نے ریلوے جیسے ادارے کو تباہ کر کے گڈز ٹرانسپورٹ اور پرائیویٹ بسیں سڑکوں پر چلائیں۔ ڈاک خانہ کے نظام کو درہم برہم کر کے پرائیویٹ کوریئر سروس چلائی گئی۔ اسی طرح سرکاری سکولز اور کالجز کے اساتذہ اپنے بچوں کو پرائیویٹ اداروں پڑھا کر ایک طرف فخر محسوس کرتے ہیں تو دوسری طرف قوم کو یہ پیغام دے رہے ہیں کہ سرکاری اساتذہ اپنے اداروں میں معیار تعلیم سے مطمئن نہیں ہیں۔ گویا صرف غریب کے بچے ہی سرکاری سکولز اور کالجز میں پڑھتے ہیں، جن کو پرائمری تعلیم بھی ڈھنگ سے نہیں دی جاتی تو وہ بڑے ہو کر ایلیٹ کلاس کے بچوں کا کیسے مقابلہ کریں گے۔ ان وجوہات کے سبب مصنف قاری سے سوال کر رہا ہے کہ ہم نے اس گلے سڑے نظام اور اس قوم سے امیدیں باندھی ہوئی ہیں، جس نے کرونا کے دنوں میں بھی ذخیرہ اندوزی اور منافع خوری کی اور اس کام میں ملکہ رکھتی ہے:

> "کافروں کے ہاں جب بھی کوئی آفت زلزلہ طوفان یا سیلاب آتا ہے وہ کھانے پینے کی چیزوں کے نرخ آدھے کر دیتے ہیں یہاں تک کہ مسلمان باسیوں کے مذہبی تہواروں پر سستی چیزیں فروخت کرتے ہیں اور مسلمان ذخیرہ اندوزی، دگنا منافع خوری کے لیے ایسے ہی موقع تلاش کرتے ہیں۔"(6)

تقسیم ہند کے وقت ہندوستان سے آنے والے مہاجرین بڑے بڑے خواب سجائے پاکستان ہجرت کر کے آئے تھے، انھیں یہ لگتا تھا کہ قائد کے منشور کے مطابق پاکستان میں عدل و انصاف کا قانون ہو گا۔ سفارش کلچر کی حوصلہ شکنی کی جائے گی اور اسلامی نظام حکومت ہو گا۔ اس خوش فہمی میں وہ ہجرت کر کے ہندوستان سے پاکستان تو آ گئے لیکن یہاں آ کر سوائے مایوسی کے کچھ نہ ملا۔ کیونکہ ان کی نظر میں اگر نظام میں تبدیلی نہیں آنی تھی تو آبادی کو تسقسیم کر کے کیا ملا۔ بلکہ دلوں میں قدورتیں پیدا ہوئیں اور نفرتوں میں اضافہ ہی ہوا۔ مصنف تقسیم ہند پر بھی تنقید کرتے ہوئے یہ نظریہ رکھتا ہے کہ اگر قائد زندہ بھی ہوتے تو اس ملک کا کوئی پرسان حال نہیں ہونا تھا کیونکہ انگریزوں نے ملی بھگت سے جاگیرداروں کو جناح کی مسلم لیگ میں شامل کروایا تھا اور دیکھا جائے تو آج بھی ہمارے ہاں ہر الیکشن سے قبل سیاست دانوں کو مختلف قسم کے لالچ دے کر وفاداریاں تبدیل کروائی جاتی ہیں۔(7) ناول نگار تعلیم یافتہ پاکستانی عوام پر بھی طنز کرتے ہیں کہ یہ پڑھے لکھے ہونے کے باوجود سیاسی شعور سے نابلد ہیں اور پرچی کلچر اور تھانہ کچہری کی سیاست کو پرموٹ کرتے ہیں۔ غریب تو نہیں جانتا کہ ووٹ کے نام پر کتنا بڑا دھوکہ دیا جاتا ہے۔ وہ کبھی برادری کے سامنے ووٹ کے لیے حامی بھر لیتا ہے تو کبھی ظالم اور بے حس جاگیر دار کے ڈر سے برائے نام ووٹ ڈالتا ہے۔

ناول کے مطالعہ سے اندازہ ہوتا ہے کہ مصنف ماہر نفسیات بھی ہیں، کہانی کے اہم کرداروں کی تحلیل نفسی برجستگی سے کی ہے ۔ مصنف نے مشرقی سماج میں زیست گزارنے والے مرد کی نفسیاتی کیفیت یوں بیان کی ہے کہ قاری کو مرکزی کردار سے لاشعوری طور پر ہمدردی ہونے لگتی ہے۔ پاکستان میں زیادہ تر مشترکہ خاندانی نظام رائج ہے، جس میں سب سے زیادہ مظلوم مرد ہوتا ہے۔ کیونکہ رشتوں کے تقدس کو بحال رکھنے لیے ایک طرف ماں اور بہنوں کو بھی راضی رکھنا پڑتا ہے تو دوسری طرف بیوی کی فرمائشیں بھی پوری کرنی ہوتی ہیں۔ گویا مرد ان رشتوں کی مثلث میں پرکار کی طرح گھومتا ہے لیکن گھر کے کفیل سے کوئی خوش نہیں ہوتا ہے۔

عمومی طور پر مشرقی سماج میں یہ سمجھا جاتا ہے کہ مرد عورت پر ظلم کے پہاڑ توڑ دیتا ہے، جو سراسر غلط ہے۔ حقیقت تو یہ ہے کہ عورت ہی دوسری عورت کا کسی بھی صورت میں وجود برداشت نہیں کرتی ہے۔ ایک ہی گھر میں ساس، نند اور بہو زندگی بسر کر رہی ہیں لیکن آپس میں حسد اور منافقت کے سبب ایک دوسرے کی ازلی دشمن بن جاتی ہیں۔ مصنف نے ناول میں خواتین کی نفسیات کی کئی پرتیں کھولی ہیں۔ ناول کے آغاز میں جب مرکزی کردار کرونا کے دنوں میں کہانی مکمل کرنے لیے گھر رکتا ہے تو صغرا گھر کچھ مالی امداد کے لیے آتی ہے۔ وہ بیوہ اور چار بچوں کی ماں ہے۔ گھر میں کام کرنے والی نوکرانی "زرینہ "اس کے کردار پر اس طرح کیچڑ اچھالتی ہے کہ مرکزی کردار شرمندگی کے باعث منہ نیچے کیے رکھتا ہے، بعد ازاں وہ نوکرانی واحد متکلم کی بیوی کو بھی ساری داستان سناتی ہے تو وہ بات بات پر اپنے خاوند کو طنزیہ جملے بولتی ہے۔ یعنی کہ مشرقی خواتین اپنی ہی ہم جنس سے جلن رکھتی ہیں۔

ناول نگار نے عورت کے کئی روپ کہانی میں آشکار کیے ہیں۔ صغرا لاوارث اور بے بس عورت ہے۔ اپنے بچوں کا پیٹ پالنے کے لیے کبھی تو وہ کسی کے گھر محنت مزدوری کرنے لیے کام کرتی ہے تو کبھی امداد کے لیے سفید پوش افراد کے پاس جاتی ہے لیکن ہر مرد نے اس کی مجبوری کا فائدہ اٹھاتے ہوئے اپنی جنسی ہوس کا نشانہ بنایا، جس کے سبب گاؤں میں اس کی شناخت بطور طوائف ہوتی ہے، مرکزی کردار، جو تعلیم یافتہ باشعور فرد ہے وہ انسانی ہمدردی کے ناطے یا کہانی کی تلاش میں صغرا کے پاس کھڑا ہوتا تو ہر گزرنے والا آدمی واحد متکلم کو جنسی ہوس پرست سمجھ کر طنزیہ جملے بولتے ہیں۔ مثلاً جب مرکزی کردار چکی سے آٹا لینے جاتا ہے۔ وہاں صغرا کو دیکھ کر اس کو آٹا خرید دیتا ہے تو چکی والا مرکزی کردار کو بھی اسی قماش کے لوگوں میں شمار کر لیتا ہے۔ ناول نگار نے واحد متکلم کا کردار ایسے مرد کا تشکیل کیا ہے، جو عورت کو انسان سمجھتا ہے، جو جذبات اور احساسات سے معمور ہوتی ہے، کہانی میں جب مرکزی کردار صغرا کو بغیر کسی لالچ کے دو سو روپے دیے تو وہ پھوٹ پھوٹ کر روتے ہوئے فرشتے کا درجہ دینے لگی اور صاحب کے متعلق یہ رائے دی:

> "صاحب جی! آپ پہلے آدمی ہیں، جس میں انسانیت کی رمق نظر آئی ہے۔ آج مجھے احساس ہوا کہ میں بھی انسان ہوں اور یہ احساس آپ نے دلایا۔ مجھے تو کبھی کسی نے انسان تو کجا عورت بھی نہیں سمجھا۔ ہر کوئی استعمال کی چیز سمجھ کر برتنے کی کوشش کرتا ہے۔ سچ کہتی ہوں اگر کوئی ایک ٹافی بھی دیتا ہے تو بدلے میں میرا بدن نوچتا ہے۔ محلے میں ایسا کون سا مرد ہے جس نے۔۔۔۔۔ اب میں ذلتوں کی عادی ہو گئی ہوں۔"(8)

محولا بالا اقتباس پاکستانی سماج میں انسانیت کے ناطے مردوں کی اقسام کی نمائندگی کرتا ہے کہ خواتین یا معاشرہ تمام مردوں کو ایک جیسی فطرت کا حامی سمجھتا ہے لیکن حقیقت اس سے برعکس ہے اسی سماج میں ہوس پرست درندے بھی موجود ہیں تو واحد متکلم جیسے شریف النفس انسان بھی، جو عورت کی مجبوریوں کو سمجھتے ہوئے اس کو غلیظ القابات سے پکارنے کے بجائے اپنی حیثیت کے مطابق مدد کرتے ہیں۔

ناول میں پولیس کے کردار پر بھی طنز کیا گیا ہے۔ یہ وہ ریاستی ادارہ ہے، جو عوام کی جان و مال کی حفاظت کرنے اور مجرموں کو پکڑ کر عدالت میں پیش کرنا اس کے فرائض میں شامل ہے، لیکن ہماری پولیس جھوٹی ایف آئی آر کاٹ کر مجرموں سے پیسے لے کر چھوڑ دیتی ہے بلکہ ہر واردات میں مجرموں کی پشت پناہی بھی کرتی ہے۔ ناول میں ایوب کے کردار کے ذریعے جیل کے اندر کی دنیا کی بھی عکس بندی کی گئی ہے، جب جیل میں شکیلہ اپنے منگیتر ایوب کی ملاقات کرنے جاتی ہے تو وہ کہتا ہے کہ میں جیل کی باطنی دنیا کو قریب سے دیکھ رہا ہوں۔ یہاں پولیس ہلکار اور عادی مجرم نشے کا دھندہ کرتے ہیں اور کل رات تو حد ہی ہو گئی کہ کو پولیس کی ملی بھگت سے ایک ملزم کو ایک شخص کو قتل کرنے کے لیے ایک دو

گھنٹے کے لیے چھوڑا گیا اور وہ اپنا ٹاسک پورا کر کے واپس آ گیا۔ یہاں ایک طرف پولیس کی جیب گرم ہوئی اور دوسری طرف قاتل گمنام ہو جاتا ہے ۔ ایسے واقعات پاکستانی ریاستی اداروں پر بڑا سوالیہ نشان چھوڑتے ہیں۔ اسی وجہ سے عام شہری ان اداروں کے کام سے نہ مطمئن ہوتا ہے اور نہ ہی ان پر اعتماد کرتا ہے۔

ناول کی کہانی میں بظاہر جان محمد اور حاجرہ کی لازوال داستان محبت بھی مرکزی حیثیت رکھتی ہے لیکن حاجرہ کی اپنے پھپھوزاد اسلم نامی شخص سے شادی کے بعد بھی ساری زندگی جان محمد کی محبوبہ کے طعنے سنتی ہے اور خاوند سے بات بات پر مار کھاتی ہے۔ اس سے بڑا المیہ یہ ہے کہ حاجرہ کو اپنا بچہ حلالی قرار دینے کے لیے پیروں، فقیروں کے کہنے پر برگد کے سوراخ سے گزرنا پڑتا ہے۔ مصنف سماج کا خوفناک عکس دکھا رہا ہے۔ جہاں اگر کوئی عورت محبت جیسے لطیف جذبے سے سرشار ہو بھی جائے تو اس بے حس سماج کے آگے وہ محبت بھی تہمت بن جاتی ہے، جیسا کہ ناول میں حاجرہ کے ساتھ ہوا ہے۔

"چاند پور" کی کہانی ایک انفرادیت یہ بھی ہے کہ مصنف کے اپنے ارد گرد کے کرداروں کی نفسیات، حالات و واقعات کے ساتھ ساتھ اپنے قاری کو ماضی کی بھی سیر کروائی ہے۔ ناول نگار نے مختلف قدیم تہذیبوں مثلاً ہڑپہ، تلمبہ اور قبولہ شہر کی تاریخ کو اس انداز سے کہانی کے ساتھ انسلاک کیا ہے کہ معلومات کے ذخیرے کے ساتھ دلچسپی کا عنصر بھی برقرار رہتا ہے کہیں بھی قاری وہ تاریخ پڑھتے ہوئے اکتاہٹ محسوس نہیں کرتا ہے مثلاً ہڑپہ کے متعلق بتاتے کہ یہ پنجابی کا لفظ ہے اور اس کا قدیم نام "ہری یوپیا" تھا اور یہ تہذیب عراق اور یونان و مصر کی تہذیب کے ہم عصر ہے۔ ہڑپہ کو تین دفعہ دریاؤں کی لہروں نے آلیا اس کے باوجود ہڑپہ تہذیب آج بھی اپنی شناخت رکھتی ہے اور " قبولہ شہر کی تاریخ پانچ ہزار برس پرانی ہے۔ اس کا قدیم نام "گڑھی کھیکھڑ" تھا اور اس کا موجودہ نام " قبولہ " غیاث الدین تغلق کے کمانڈر " قبول خان کی مناسبت سے رکھا گیا ہے۔ یہاں تاریخ میں مشہور لوک داستان کے ہرو(ہیر رانجھا) نے بھی قبولہ کے حکمران کے ہاں پناہ لی تھی۔ گو قاری ناول کا یہ حصہ پڑھتے ہوئے تاریخ کے گمنام گوشوں میں کھو جاتا ہے لیکن کہانی در کہانی یوں بیان کیا ہے کہ ناول کے کرداروں کے ساتھ اس تاریخ کو جوڑ کر دلچسپ بنا دیا۔ اسی مناسب سے ہم کہہ سکتے ہیں کہ "چاند پور" تہذیب و تاریخ کا آئینہ بھی ہے۔(9)

ناول میں ٹانگے، بسیں، ریلوے اسٹیشن، ریل گاڑی، پلیٹ فارم، دیہاتی کلچر اور وہاں کی بود و باش وغیرہ کو بطور علامت اس انداز سے برتا ہے کہ عصرِ حاضر کا قاری اپنی تہذیب و تاریخ سے شناسا ہو جاتا ہے، جس نے صرف ذاتی گاڑی یا ہوائی جہازوں پر سفر کیا ہے۔ یہ تاریخی مقامات اور تہذیب کہانی پر حامی نظر آتے ہیں۔ دروانہ نوشین خان لکھتی ہیں:

> "چاند پور" جغرافیائی تغیر و تبدل اور تاریخی عروج و زوال کی دائم رواں کہانی ہے۔ قدیم زمانے کو کرونا والے جدید تر زمانے کے ساتھ یوں ملا یا دیا گیا کہ وقت ایک سطح بہار حقیقت بن گیا ہے۔ ناول میں ریل گاڑی، ریلوے اسٹیشن، پلیٹ فارم اپنی کھنڈراتی حالت کے باوجود مناظر میں حاوی نظر آتے ہیں"(10)

ناول میں "واحد متکلم" کا ہمجان " ساتھ والا" جو کہ خاموش تماشائی بن کر سماج کے ہر کردار پر کڑھتا ہے۔ ناول نگار نے بڑی چابکدستی سے ایسا کردار تخلیق کیا ہے، جو بظاہر کوئی مکالمہ ادا نہیں کرتا لیکن پاکستانی گھٹن زدہ سماج پر اپنی رائے کا اظہار کرتا ہے بلکہ راقم کے مطابق پاکستان میں اشرافیہ کی عیاشیاں اور غریب طبقے کے مسائل کے خلاف مزاحمت اور احتجاج کرتا نظر آتا ہے۔ اس کردار کے متعلق فکشن کے بڑے نقاد ڈاکٹر انوار احمد ناول کے فلیپ پر لکھتے ہیں:

"اس ناول میں متکلم کے ساتھ اس کا "دوسرا" یا "ساتھ والا" ہے جو اسے کچوکے لگاتا ہے کہ کہنے کی اصل بات پر پردہ کیوں ڈال رہے ہو میرے نزدیک اہم ترین بات یہ ہے کہ پاکستانی سماج کو قدامت پسندی تنگ نظری اور تہمت ترازی کی طرف دھکیلنے والی قوتوں کے خلاف مزاحمت کرتا ہے"(11)

مجموعی طور پر "چاند پور" میں سیدھے سپاٹ بیانیے کے ذریعے معاشرے کا ایسا عکس بیان کیا ہے۔ جہاں ایک حساس فرد کے لیے سانس لینا بھی دشوار ہو گیا ہے۔ مصنف نے جیتے جاگتے کرداروں کے ذریعے ارد گرد کے ماحول، گھریلو زندگی کی عکاسی، دیہاتی زندگی کی عکس بندی ایک ہی کہانی میں ایسے پیوست کیا ہے کہ قاری کو معاشرے کی تمام غلاظت اپنے اندر محسوس ہوتی ہے۔ راقم کے نزدیک "چاند پور" کو ان چند ناولوں کی فہرست میں شامل کیا جا سکتا ہے، جس میں متنوع موضوعات پر کہانیاں قلم بند کی ہیں۔

حوالہ جات

1۔شاہد رضوان،"چاند پور"،لاہور:دانیال پبلشرز،2023ء،ص:09

2۔پروین سجل،"پران شدہ کہانی۔۔۔اور'چاند پور'ناول،مشمولہ الحمرا(ماہنامہ)،لاہور اکتوبر2023ء،ص:160

3۔شاہد رضوان،"چاند پور"ص:228

4۔ایضاً،ص:225

5۔ایضاً۔ص:16

6۔ایضاً،ص:54

7۔ایضاً،ص:77

8۔ایضاً

9۔ایضاً،ص:297،173

10۔دروانہ نوشین خان،"چاند پور شاہد رضوان کاناول"مشمولہ الحمرا،ص:159

11۔شاہد رضوان،"چاند پور"،فلیپ

Referencs

1. Shaid Rizwan, "Chand Pur", Lahore: Dainal publishers, 2023,p:09

2. Parveen Sajal, "Puran shuda kahani...... aur Chand Pur Novel"Mashmola Alhamra (Monthly), Lahore, 0ct, 2023, p: 160

3. Shaid Rizwan, "Chand Pur"p: 228

4. Ibid.p:225

5. Ibid.p:16

6. Ibid, p: 54

7. Ibid,p:77

8. Ibid

9. Ibid,p:173,297

10. Darona Nosheen Khan,"Shaid Rizwan ka Chand Pur", Mashmola Alhamra (Monthly), p: 159

11. Shaid Rizwan, "Chand Pur", Flape